

نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسول

(حدیث کا مقام نظامِ شریعت میں)

نعیم صدیقی

حدیث کے اور عمل کی ابتدا خواجہ کی طرف سے ہوئی، پھر معتزلہ نے مستقل طور پر ان کی جگہ لے لی۔ لیکن امت کے سوا اہل علم اور اس کے چوٹی کے علماء و مفکرین نے اس فتنہ کی اس طرح مکمل سرکوبی کر دی کہ یہ دوبارہ سر اٹھانے کے لیے پورے ایک ہزار سال تک موقع نہ پاسکا۔ بدقسمتی سے ہمارے دور میں جب احیائے اسلام کا جذبہ مسلمانوں میں نمودار ہونے لگا تو اس کے متوازی اس فتنہ نے بھی پھر سر اٹھایا۔ بزرگمندی کی تاریخ میں فتنہ انکار حدیث کی ابتدا سرسید نے فرمائی، پھر اس کا علم مولوی عبداللہ چکرا لوی اور مولوی محمد دین امرتسری نے اٹھا لیا، پھر عرشی صاحب اور مولانا اسلم حیراچودی میدان میں آئے اور اب پروردگار صاحب اور برحق صاحب اس معرکہ کے جانناز مجاہد ہیں۔ ان حضرات نے حدیث کے خلاف از سر نو معرکہ چاکر کر کے ہونے قریب قریب وہی پرانے ہتھیار اٹھائے ہیں جن کو ایک مرتبہ اہل حق نے بالکل کند کر دیا تھا۔ یہ بات تو واضح ہے کہ یہ فتنہ کوئی مثبت طاقت نہیں ہے کہ یہ ایک دعوت و تحریک بن سکے، اس سے نتیجہ جو پیدا ہو سکتا ہے وہ صرف ذہنی انتشار ہے۔ ذہنی انتشار پیدا کرنے کے لیے بالعموم جو اسالیب کا مجرب پس ٹھیک انہی سے اس فتنہ کے علمبردار کام لے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان سے خطاب کرنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے اور ان کے مقابلے میں اول قدم پر ہی اعتراف شکست کر لینے کو اپنے حق میں موجب خیر سمجھا ہے۔ مگر اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کرتے ہوئے ہم اپنا فرض یہ سمجھے ہیں کہ جو ام کو ہر قسم کے ذہنی انتشار سے بچایا جائے۔ اسی بنا پر رقم الحروف ایک عرصہ سے حدیث کے

موضوع پر قلم اٹھانے کی تیاری کر رہا تھا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس موضوع کے تقاضوں کے لحاظ سے اپنی علمی استعداد کو ناقص پا کر ہمیشہ تامل رہا۔ مگر بالآخر طبیعت اس پر ٹھک گئی کہ اپنے علم کی حد تک جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے وہ مجھے بہر حال ادا کر دینی چاہیے۔ واضح رہے کہ اس مقالہ میں میں نے مخالفین حدیث کو جواب دینے کے بجائے اثباتی طور پر گفتگو کی ہے، اس میں جہاں کہیں ترویجی انداز آتا ہے وہاں مجھوری کا مقام ہے۔ میرے نزدیک مقالے کا حصہ اول یعنی منصب رسالت ہی اس کا اصل حصہ ہے۔ بعد کی ساری بحث اسی حصہ پر مبنی ہے (نہ میں)

حصہ اول — منصب رسالت

نظام دینی میں رسول کا مقام

خدا اور رسول | دنیا میں ایسے ناقص ذہین کے لوگ کم ہی پائے گئے ہیں۔ اور اس دورِ الحاد میں بھی کم ہیں۔ جو مطلقاً خدا کی ہستی کا انکار کرنے والے ہوں۔ مادہ جی جس کائنات میں پیدا ہوتا اور زندگی گزارتا ہے وہ اپنے بنانے والے کے وجود پر اتنی بدیہی شہادتیں اپنے اندر رکھتی ہے کہ ان کا انکار کرنے کے لیے سخت دوسرے کی بلاوتِ ذہن اور ایک انتہائی اندھے پن کی ضرورت ہے۔ پوری کائنات تو بڑی چیز ہے اس عجائب خلتے کاہر شعبہ اور ہر حصہ اس کل کا پرچہ، اس تعمیر کا ہر ذرہ انسانی بصیرت کے لیے ایک ایسا درقی معرفت ہے کہ جس کی آیات اپنے مطالعہ کرنے والے کو صرف اسی حقیقت تک لے جا کر نہیں چھوڑ دیتیں کہ سورجوں اور چاندوں، دریاؤں اور پہاڑوں، ہواؤں اور گھٹاؤں، بجلیوں اور خرمٹوں، کلیوں اور کائناتوں، چوپایوں اور پرندوں کی اس دنیا کا ایک بنانے والا ہے، بلکہ یہ آیات دنیا کے خالق کی بہت سی صفات کو بھی واضح کر دیتی ہیں۔ مادے اور قوت کا یہ کارخانہ بول بول کے رہا ہے کہ اس کا بنانے والا اور چلانے والا کئی ارادہ و اختیار کا مالک ہے، وہ علیم و خیر اور سمیع و بصیر ہے، وہ حکیم اور دان ہے، وہ رحیم و کریم ہے، وہ عالم الغیب و الشہادہ ہے، وہ فوق العوق اور دراء الورد ہے، وہ بے نیاز اور غیر محتاج ہے، وہ حق و قیوم ہے، وہ قائم و دائم ہے۔ وہ مدد دیکتا ہے، دنیا کے اس درس معرفت کو جھٹلا

میں نے کے بعد پھر اس فعل کی کوئی کلید نہیں رہتی، پھر اس معنی کا کوئی حل نہیں رہتا، پھر اس الجھاؤ کو سلجھانے کوئی فکر ہی بنیاد باقی نہیں رہتی، پھر اس لفظ میں کوئی معنی پیدا نہیں کیے جا سکتے، پھر اس کلمے کے اجزا میں کوئی منطقی ربط قائم نہیں کیا جا سکتا، پھر اس غزل کا نہ کوئی مطلع و مقطع رہتا ہے، نہ وزن و بحر اور نہ قافیہ و ردیف، اچنانچہ انسانیت من حیث المجموع، یا با لفاظ دیگر نبی آدم کے نوعی ذہن نے ہمیشہ خدا کے وجود کو مانا ہے، اور اس حد تک اس کی صفات کو بھی تسلیم کیا ہے!

لیکن کائنات کی آیات جب انسان کو یہاں پہنچا دیتی ہیں تو ایک اہم تر سوال خود بخود اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا ہے تو اس سے انسان کا رشتہ کس نوعیت کا ہے؟ آیا اس کے کچھ مطالبات انسان سے ہیں؟ آیا وہ کوئی ذمہ داری اس پر ڈالتا ہے؟ آیا وہ اس کے کسی امر میں اطاعت تسلیم چاہتا ہے؟ آیا وہ اسے کوئی ضابطہ و قانون دیتا ہے؟ آیا وہ اس سے کوئی حکم منواتا چاہتا ہے اور کسی شے سے اسے روکتا ہے؟ آیا وہ کسی بات سے خوش یا ناخوش ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو کن باتوں سے؟ اس کی مرضی کیا ہے؟ اس کی پسند و ناپسند کیا ہے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے کبھی ایسا نہیں ہو کہ خدا خود زمین پر اتر کر آیا ہو، پھر وہ ایک ایک فرد انسانی کے پیچھے اپنی دعوت لیے دوڑتا پھرے، بلکہ انسانی ہدایت کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے رہنما اٹھائے اور انسانی نظام تہذیب و تمدن کو صالح بنیادوں پر استوار کرانے کے لیے اس نے خود انہی میں سے مہمدر کھڑے کیے۔ اصل میں آدمی کی فطرت اور اس کی ساخت ایسی نہیں ہے کہ حقیقت مطلق کا اور ایک براہ راست راہت کر سکے۔ اس کے حواس اطلاق کی تضادوں میں بالکل جواب دے دیتے ہیں، وہ کسی پیغام کو بھی اخذ کر سکتا ہے کہ وہ تعبیرات و تحدیدات کے سانچوں میں ڈھال کے اس کے سامنے لایا جائے یہی نہیں، اس کی فطرت کے تقاضے اس طرح بھی پورے نہیں ہو سکتے کہ فرشتے اس کے سامنے دعوت کا علم اٹھائیں اور اس کی قیادت کا فرض سرانجام دیں۔ اس کا محدود دماغ اپنی فکر کے چرخ براہ راست انوار الہی سے کبھی روشن نہیں کر سکا بلکہ وہ عقیدہ و ایمان کے دئے صرف اس شعاع حقیقت سے جلا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے انسانی دماغوں ہی کے اندر فروزاں کیا ہے، آدمی کو جو کان دئے گئے ہیں وہ اللہ کی آواز کو اسی

صورت میں منسکتے ہیں جبکہ وہ انسانی آلات نطق سے بلند ہوئی ہو اس کے جذبات میں تاثر بھی پیدا ہوتا ہے جب کہ اللہ کی پسند و ناپسند پہلے انبیاء کے اندر مطلقاً انسانیت کی لہریں اٹھا دے، وہ اخلاقی نمونہ اگر حاصل کر سکتا ہے اور سیرت کا کوئی چربے سکتا ہے تو نہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے، اور نہ اس کے فرشتوں یا کسی دوسری فوق الانسانی مخلوق سے، بلکہ اپنے ہی جیسے انسانی افراد سے لے سکتا ہے۔ عیب کبھی بھی اللہ کے دین کی بنیادوں پر منظم ہوا ہے تو اپنی فطرت کی محدودیتوں کی وجہ سے خود اپنی ہی کی طرح کے کسی انسان کے گرد منظم ہوا ہے اور اسلامی انقلاب کا سپاہی جب بھی وہ بنا ہے تو اپنے ابناء کے نوع کے زیر قیادت ہی بنا ہے۔ انسانی فطرت کی انہی خصوصیات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں بہترین افراد انسانی کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے کہ ایک طرف ان کے قلوب اللہ تعالیٰ سے الہام عاقلہ حاصل کریں اور دوسری طرف وہ عام انسانوں کے لیے الہامی دعوت کے دیانت دار ترجمان اور انسانی پیکر میں اس کے تفصیلی تقاضوں کا عملی مظہر ہوں۔

پس کائنات خدا کے وجود اور اس کی بعض صفات کی گواہی دے دینے کے بعد انسان کو جس مقام پر چھوڑ دیتی ہے اس مقام سے آگے چلنے کے لیے یعنی خدا کی مرضی، اس کی ہدایت، اس کے قانون، اس کی پسند و ناپسند کو معلوم کر کے زندگی کو اس کے مطابق بنانے کے لیے انبیاء کا مرحوم منت ہوئے بغیر چارہ نہیں۔ خدا کی ہستی کی محدود سی معرفت کے لیے تو انفس و آفاق کی آیات مدد دیتی ہیں، لیکن اس کی عظمت کے لیے رسالت کا دامن تھامنا ناگزیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی زندگی کی صلاح و فلاح بجز ایمان باللہ پر منحصر نہیں ہے بلکہ ایمان باللہ رسالت بنیادی طور پر اس کے لیے ضروری ہے۔ فکر کا ہنا خانہ اگر مظاہر کائنات کے چراغوں سے کسی قدر روشن ہو بھی جائے تو بھی عمل کی دادیاں اس وقت تک اندھیلکی رہتی ہیں جب تک کہ انبیاء کے چلا ہوئے دیوں سے ان کو متورنہ کیا جائے۔ محض خدا کے تصور کے بل پر زندگی

لے یہ حقیقت دین جس ہی سے یہ خاص نہیں بلکہ اگر شیطان بھی اگر اپنا کوئی دین انسانوں میں چلاتا چاہے تو وہ بھی اس کام کے لیے انسانوں ہی کے اندر سے داعی اور لیڈر اور نمونہ کے پیشوا تیار کرنا ہے۔

— اور نظام زندگی — کی تعمیر ممکن نہیں ہے، بلکہ خدا کے تصور کو سنگ اساس کی حیثیت دے کر جب اس تعمیر کو برپا کرنا ہو تو اس کا سارا مسالہ اور اس کا فن تعمیر اور اس کا نقشہ تعمیر صرف انبیاء ہی کے ذریعے مل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فکر کے حاملین نے بالاتفاق یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ ایمان بالرسالت کے بغیر ایمان باللہ بے کار ہے، جیسے کسی شاہنشاہ کی وفاداری کا اقرار بغیر اس کے مقرر کردہ دائرے یا گورنریا چیف جسٹس یا جرنیل کی وفاداری کے عملاً بے کار ہے۔ مجرد ایمان باللہ دیکھ کر یوں کہنے کہ ایمان بر ذات الہی، ایک جامد عقیدہ ہے کہ جس سے نہ عملی زندگی کا درخت نمودار ہو سکتا ہے اور نہ اس پر پھل آسکتا ہے۔ اس عقیدے کے بیج سے اگر عملی زندگی کا درخت اُگ سکتا ہے اور اگر اس پر برگ و بار آسکتا ہے تو صرف اس طرح کہ تعلیمات انبیاء سے اس کی آبیاری کی جائے! محض ایمان باللہ سے نصوح پیدا ہو سکتا ہے، یوگ پیدا ہو سکتا ہے، رہبانیت پیدا ہو سکتی ہے، لیکن کوئی نظام زندگی، کوئی تہذیب، کوئی معاشرت، کوئی تمدن اور کوئی معیشت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایمان باللہ سے نظام زندگی اسی صورت میں رونما ہوتا ہے جبکہ ایمان بالرسالت ساتھ کے ساتھ موجود ہو۔ رسالت کا انکار کرنے کے بعد خدا کا تصور ایک ایسا خاکہ بن کے رہ جاتا ہے جس میں ہر کوئی اپنے من مانے رنگ بھر سکتا ہے، اس کے ساتھ جو صفات چاہے منسوب کر سکتا ہے، اپنے فلسفیانہ قیاس اور اپنے مقننہ تئیریکوں سے جس ضابطہ کو چاہے اس کے نام سے اپنے سامنے رکھ سکتا ہے، اور اس کی پسند و ناپسند اور رضا اور ناراضی کا جو تصور چاہے قائم کر سکتا ہے۔ پھر خدا کی مرضی اور اس کے احکام کوئی ایسی حقیقت نہیں ہو سکتے جس پر ساری انسانیت تو کجا، دو آدمی بھی ہم خیال ہو سکیں۔

بات اتنی ہی نہیں کہ ایمان باللہ کے تعلق سے پورے کرنے کے لیے ایمان بالرسالت بنیادی ہریت رکھتا ہے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خدا کی اطاعت منحصر ہی نبی کی اطاعت پر ہے۔ خدا نے اپنے لاہول کو اتنی ٹیڑھی اتھارٹی دی ہے کہ جو کوئی اس کی مرضی پوری کرنا چاہے وہ انبیاء کی بے چون و چرا اطاعت کرے، اور جس نے ان کی اطاعت سے انحراف کیا اس نے خود خدا سے بغاوت کی۔ جو ان کا ہوا وہ خدا کا ہے اور جو ان کا نہیں وہ خدا کا بھی نہیں۔ جس نے ان کے بتائے ہوئے حلال و حرام کو تسلیم نہ کیا

اس نے گویا خود اللہ ہی کے صواب سے منہ موڑا جس نے اُن کی ہدایات کا اتباع نہ کیا اس نے خود اللہ ہی کا قانون پا مال کر ڈالا۔ نبوت و رسالت کا منصب ہے ہی ایسا کہ اس کے ساتھ اتنی ہی بڑی اتھارٹی ہونا لازم ہے۔ خدا کو اپنے بندوں سے جو بات بھی کہتی ہے اس کا واسطہ نبی یا رسول ہی کے آلاتِ نطق ہیں، وہ اپنے بندوں کو جو طرزِ فکر اور جو زاویہ نگاہ دینا چاہتا ہے اس کا مظہر نبی یا رسول ہی کا ذہن ہے، وہ اپنے بندوں میں جیسے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے ان کی لہریں سب سے پہلے انبیاء و رسلِ نبی کے قلب سے اٹھاتا ہے، وہ جس سیرت و اخلاق کو پسند کرتا ہے اس کا معیار وہ انبیاء و رسل ہی کو بناتا ہے، وہ جس تحریکِ خیر و قلاح کو تاریخِ انسانی میں برپا رکھنا چاہتا ہے اس کے لیے انبیاء و رسل ہی کو بدرقہ (Pillar) بناتا ہے اور وہ جس تہذیب و تمدن کو انسانی ارتقاء کے لیے موزوں قرار دیتا ہے اس کی تعمیر کا کام انبیاء کی ہی نگرانی میں کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انبیاء و رسلِ نبی کے مستند نمائندے ہوتے ہیں اور ان کا ہر قول و فعل اپنے پیچھے بڑی اتھارٹی رکھتا ہے۔

اَلکتابُ اور الرسول | سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں نہ ایسا ہوا کہ مرضی الہی کو واضح کرنے والی ایک کھلی لکھی کتاب آسمانوں سے اترائی ہوتی، یا اس کے نسخے ایک ایک فردِ انسانی پر اتار دئے جاتے، یا کوئی غیبی قوت ایک بھاری آواز کے لاڈو سپیکر سے دعوتِ الہی کو بیک دم ساری دنیا کو سنا دیا کرتی، خدا، امرِ مطلق، حاکمِ لائٹریک اور واحدِ حشرِ شہدہ قانون کی شان کے یہ منافی معلوم ہوتا ہے کہ کسی فردِ انسانی کو یہ اتھارٹی دے کر بھیجا جائے کہ اس کا لفظ لفظ خدا کی مرضی کا بیان تسلیم کیا جائے، اس کا ایک ایک فعل خدا کی طرف سے واجبِ تقلید نمونہ مانا جائے اور اس کے ہر اشارہ اور ہر اشارہ کے ساتھ ساتھ حرکت کی جائے۔ سرے سے اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ خدا نے جب اپنی مرضی کو واضح کرنے کے لیے کتابیں نازل کی ہیں تو پھر رسولوں کو نازل کرنا ایک نائد از ضرورت فعل معلوم ہوتا ہے!

اس سوال کے جواب تک پہنچنے سے پہلے ایک اور سوال غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ آیا مجھ کو ایک کتابِ انسانی ہدایت کے لیے کافی ہو سکتی ہے؟ اس چیز کو سوچنے اور عملی زندگی سامنے رکھ کر سوچنے۔ کیا کوئی تنجیم سے تنجیم کتاب پوری انسانی زندگی — بلکہ اس کے کسی ایک شعبے کے پورے عملی

تقاضوں کو سمیٹ سکتی ہے؟ کیا وہ لوگوں کو از خود اپنے پورے مندرجات کے پڑھنے پر آمادہ کر سکتی ہے؟ کیا وہ ایک زندہ داعی کے جذبات اخلاص کا خلابہ پوری طرح بھر سکتی ہے؟ کیا وہ اپنے قارئین کے تمام کے تمام سوالات و اعتراضات اور شکوک و شبہات کے جواب پیشگی اپنے اندر موجود رکھ سکتی ہے اور اس کے جوابات سے پھر مزید جن سوالات کا پیدا ہونا ممکن ہو کیا ان کو اور اسی طرح ان سے آگے کے سوالات و جوابات کی پوری نسل کو بھی محیط ہو سکتی ہے؟ کیا وہ اپنے نظریہ کے مطابق کسی عملی نمونہ کو دکھانے بغیر لوگوں کو یہ اطمینان دلا سکتی ہے کہ اس کی دعوت نری تخیلاتی (Utopian) نہیں ہے کیا وہ درجہ اول، درجہ دوم اور درجہ سوم کے مختلف دماغوں کے لیے یکساں موثر اور یکساں قابل فہم اور یکساں قابل اطمینان ہو سکتی ہے؟ کیا وہ اپنے متاثرین کو سمیٹنے، سینھانے، منظم کرنے، ان کا تزکیہ کرنے، ان کے اخلاق بنانے، ان کو موقع بہ موقع ہدایات دینے، ان کو قدم قدم پر ٹوکنے، ان کو مشکلات میں تسلی دلانے، ان کو کامیابی کے مراحل پر کب سے بچانے اور مصیبتوں کے مقابلے میں ان کی ہمت بندھانے کا کام اسی طرح کر سکتی ہے جس طرح ایک زندہ داعی کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ اگر ہمارا یہ منہی جواب صحیح ہے تو ہماری عقل تقاضا کرتی ہے کہ انسانی زندگی میں جب بھی دعوت کا کوئی کام کیا جائے تو یہ کام فکر اور عمل دونوں میدان میں ہونا چاہیے اور اس کے لیے کتابی دعوت کے ساتھ ساتھ کسی زندہ داعی کو بھی میدان میں آنا چاہیے۔

اگر معاملہ محض مذہب اور دھرم اور دست کا ہوتا تب تو شاید کسی حد تک یہ صورت بھی نتیجہ خیر ہو سکتی کہ ایک کتاب میں مختصراً چند عقاید، پوجا پاٹ کی چند رسموں اور اخلاق کے موٹے موٹے قاعدوں اور ضوابطوں کی فہرستیں درج کر کے انسانیت کے حوالے کر دی جائیں، لیکن چونکہ یہاں سوال پوری انسانی زندگی کی اصلاح کا ایک پورے نظام تہذیب و تمدن کا، ایک ہمہ گیر دعوت و تحریک کا — بالفاظ دیگر ایک دین کا — درپیش ہے، لہذا یہاں کتاب کے ساتھ ایک حامل کتاب کی ضرورت بھی ہے۔ چنانچہ ہر دور تاریخ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کی رہنمائی و ہدایت کا جو انتظام کیا گیا وہ ہمیشہ مشتمل تھا "کتاب" اور "رسول" پر۔ کتاب نے ہمیشہ بنیادی فکر پیش کی اور رسول نے اس فکر

کے مطابق عملی زندگی کا مظاہرہ کیا، اَلکتاب نے انسان مطلوب کا خاکہ پیش کیا، اور الرسول نے انسان مطلوب بن کر دکھایا، اَلکتاب نے دعوت پیش کی اور الرسول نے تحریک چلائی اور نظام اجتماعی کی تشکیل کی، اَلکتاب نے بنیادیں فراہم کیں اور الرسول نے عمارت اٹھائی، اَلکتاب نے اصول دئے اور الرسول نے ان اصولوں کے سانچے میں معاشرے کو ڈھالا۔ پس دین اور ہدایت اور اسلامی نظام زندگی کا شعور حاصل کرنے کے لیے جتنی اہمیت اَلکتاب کی ہے اتنی ہی الرسول کی ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے منفک نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں ایک ہو گا وہاں دوسرے کا ہونا بھی ضروری ہے اور جہاں ایک نہ رہے وہاں دوسرا بھی نہ رہے گا۔

اطیعون کا مطالبہ خدا کے دین کو برپا کرنے میں انبیاء اور رسل کو اتھارٹی خود خدا کی طرف سے دی گئی ہے وہ انسان کے لیے سب سے اونچی اتھارٹی ہے۔ نبی اور رسول خدا کی طرف سے بات کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ وہ اس کی منشا کا نمائندہ ہے، وہ اس کی پسند و ناپسند کا واضح کرنے والا ہے، وہ اس کی طرف سے حلال و حرام کی تفریق کرنے پر مامور ہوتا ہے، وہ اس کے اور امر اور نواہی کی تعبیر و تفصیل کرتا ہے، وہ اس کے دئے ہوئے اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کرتا ہے، مختصر یہ کہ وہ اس کی اطاعت کا نمونہ اور مددگار ہے اس کی اطاعت کرنے والا ہوتا ہے۔ اس اتھارٹی کے تحت ہی مطالبہ وہ یہ کرتا ہے کہ

إتقوا الله واطیعون! خدا سے ڈرو، اور میری پیروی کرو!

یعنی ایمان باللہ سے جو ذہنیت بنی چاہیے وہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے لیے ایک خالق، ایک رب، ایک آقا، ایک ہادی اور ایک قانون ساز کا وجود تسلیم کرے، اس کے سامنے جو ابدی اور ذمہ داری کو محسوس کرے، اور اس کی پسند کو اختیار کرتے اور اس کی ناپسند سے بچنے کی فکر کرے۔ لیکن اس ذہنیت کے مطابق عملی زندگی کو ڈھالنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ ہم تن اپنے آپ کو خدا کے ہی در رسول کے جوابے کر دے اور کامل اعتماد کے ساتھ حوائے کر دے۔ مطالبہ بعض خدا کی کتاب کے مندرجات کو سامنے رکھنے کا نہیں ہے بلکہ خدا کے انبیاء و رسل پوری اتھارٹی سے تقاضا

لے پہلی چیز تقویٰ کی جس سے اور دوسری چیز متقیانہ مسلک!

یہ کہتے ہیں کہ ”طبیعوں“ بیماری اطاعت کرو! ہم جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ، ہم جس روش کو اختیار کریں اسے اختیار کرو، ہم جسے حرام کہیں اسے حرام مانو، ہم جسے حلال قرار دیں اسے حلال تسلیم کرو، ہم جو نمونہ سامنے رکھیں اسے قبول کرو، ہم جو قدیں پیش کریں ان کو زندگی کا جوہر بنا لو، ہم تم کو جس سانچے میں ڈھالنا چاہیں اس میں بے چون و چرا ڈھل جاؤ، چنانچہ نوح علیہ السلام آتے ہیں تو کہتے ہیں: اَتَقْوَاللّٰہَ وَاطِيعُونَ (الشعراء ع ۶، نوح ع ۱) ہو علیہ السلام آتے ہیں تو مطالبہ کرتے ہیں کہ: اَتَقْوَاللّٰہَ وَاطِيعُونَ (الشعراء ع ۷) پھر صالح علیہ السلام یہی دعوت ہیں (الشعراء ع ۸)۔ پھر لوط علیہ السلام اپنی بہو اتھارٹی پیش کرتے ہیں (الشعراء ع ۹) پھر شعیب علیہ السلام یہی تقاضا کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (الشعراء ع ۱۰)

آخر ایسا کیوں نہ ہو کہ اطاعت کا مطالبہ صرف اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہوتا یا اس کی کتاب کے لیے ہوتا، اور انبیاء و رسل اس طرح کی اتھارٹی کے ساتھ اپنی اطاعت کا مطالبہ کرنے کے بجائے صاف صاف یہ کہتے کہ رسول تو ہم صرف اس حد تک ہیں کہ خدا کا پیغام (یعنی اس کی کتاب) تم تک پہنچادیں، اس کے بعد ہم بھی تمہاری طرح محض پیروکار ہیں اور اطاعت کرانے کے لیے نہیں، اطاعت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ آخر اس ”طبیعوں“ کی کوئی اہمیت ہے اور اس کے اندر کوئی حکمت ہے اس ”طبیعوں“ کا صاف مطلب یہ ہے کہ محض ”اتباع کتاب“ سے خدا کا نشا اور اس کے دین کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، بلکہ پہلو کچھ ایسے بھی ہیں جن پر کتاب حاوی نہیں ہو سکتی اور ان کے لیے ایک زہدہ پیشوا کی ضرورت ہے۔

دوسرے تمام انبیاء و رسل کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی مطالبہ یہی ہے کہ اَطِيعُوا اللّٰہَ وَاطِيعُوا الرّسولَ اور یہ مطالبہ قرآن میں ایک مقام پر نہیں، کتنے ہی مقامات پر دوہرا دوہرا کہ مسلمانوں کے لیے چنانچہ کسی ایک موقع پر بھی ”اطاعت کتاب“ کا مطالبہ نہیں کیا گیا، بلکہ کتاب کے لیے ”اتباع کتاب“ کا حکم آیا ہے۔ اَطِيعُوا اللّٰہَ کَلِمَہٗ اُولٰٓئِکَ اذْنِ کَ تَخْتِ الرّسولَ کے لیے چاہی گئی ہے، کیونکہ ”اتباع“ کے بخلاف ”اطاعت“ کا معنی وہ ہو سکتا جو امر و نہی کر کے، اطاعت جو ایک امر کا کتاب صاحب امر نہیں اور رسول اللہ کی طرف سے یہ امر ہوتا ہے۔

سامنے لایا گیا۔ ان مواقع پر کسی گرامر اور کسی بلاغت کے اصول سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اطیعوا اللہ اور اطیعوا الرسول بالکل مترادف باتیں ہیں۔ کوئی منطقی یہ ثابت کر سکتی ہے کہ اطیعوا اللہ سے بھی مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے اور اطیعوا الرسول سے مراد بھی محض کتاب اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ اگر ایسا سمجھو تو سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ بعض مقامات پر صرف اطاعت الہی، بعض پر صرف اطاعت رسول اور پھر بعض مقامات پر اطاعت الہی اور اطاعت رسول دونوں کا یکجا فی مطالبہ جو پایا جاتا ہے تو آخر تدارک بیان کے اس فرق کی توجیہ کیا ہوگی! سیدھی بات جسے ایک اوسط درجے کا انسانی ذہن بھی پاسکتا ہے یہ ہے کہ اطاعت الہی کے لیے جتنا ضروری یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کے لفظ لفظ کو پیش نظر رکھا جائے اتنا ہی لازم یہ بھی ہے کہ اللہ کے رسول کے ہر قول و فعل کو بھی اسوہ اور نمونہ مان کر قبول کیا جائے۔ اللہ کی اطاعت کتاب کے اتباع اور الرسول کی اطاعت پر یکساں منحصر ہے! کتاب اگر اللہ کے طے کردہ اصول سامنے لاتی ہے تو الرسول ان اصولوں کی مستند عملی تعبیر پیش کرتا ہے۔ یہ ہے وجہ اطیعوا اللہ کے بعد اطیعوا الرسول کہنے کی!

یہ بات اسلامی نظام فکر و عمل ہی کے لیے ناصح نہیں ہے کہ اسے برپا کرنے کے لیے کتاب کے ساتھ رسول کا ہونا لازم تھا، بلکہ کوئی اور تہذیبی تحریک بھی محض کتاب کے زور سے اور بدول کسی زندہ داعی کے پردوان نہیں چڑھی اور کسی نوعیت کا نظام اجتماعی بھی ترقی کتابی فکر کے بل پر اور بلا کسی انسانی قیادت کے بپا نہیں ہوا۔ اپنے اس دور میں سے ہم اگر اشتراکی نظام کی مثال لے کر دیکھیں تو کون نہیں جانتا کہ کارل مارکس کی کتاب سرمایہ دنیا کی ان چند مانی ہوئی کتابوں میں سے ہے جنہوں نے تاریخ انسانی میں بڑے بڑے تغیرات پیدا کر دیے ہیں اور کم سے کم طحانہ فکر کی وادی میں وہ ایک نمایاں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر اس کتاب کے متعلق یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اپنے موصوعہ پر انسانی سعی کے لحاظ سے یہ ایک مکمل کتاب ہے۔ مگر اس کتاب کی انقلاب انگیز فکر اس وقت تک کچھ نہ کر سکی جب تک کہ اس کو تحریک چلانے والا مزدول داعی اینین کی شکل میں نہ مل گیا۔ اینین کے لئے یہ بات ہم چلے عرض کر چکے ہیں کہ کتاب کے لیے اطاعت کا مطالبہ اسے سے کیا ہی نہیں گیا۔

علاوہ یورپ میں اس کتاب کی فکر کو لے کر کچھ اور لوگ بھی اٹھے لیکن اس فکر کے عملی تقاضے پورے نہ کر سکنے کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ تاہم یہ تو بالکل واضح ہے کہ سرمایہ تو کجا خود اس کا مشنفت بھی اپنی پیش کردہ فکر کو عملی تحریک میں نہ ڈھال سکا۔ کتاب ایک لینن کا انتظار کرتی رہی، جب وہ نمودار ہو گیا تو کتاب کے خیالات اور اوراق سے نکل کر میدان عمل میں آ گئے۔

اس مثال سے غلط فہمی نہ ہو کہ بات تشبیہ نام کے انداز سے ہو رہی ہے۔ ہرگز نہیں! مارکس مخلوق تھا اور بے پس، مارکس سے بے شمار کوتاہیاں ہوئیں کہ جن کو پورا کرنے کے لیے بعد کے لوگوں نے کام کیا، مارکس کے نظریات پہلے خود قطعی حقیقت نہ تھے اور نہ ان میں کوئی تقدس تھا کہ ان میں قطع و برید کرتا دوسروں کے لیے حرام ہوتا۔ کجا مارکس کی کتاب اور کجا کتب الہی، کجا لینن اور کجا انبیاء و رسل! چہ نسبت خاک را با عالم پاک! یہاں ذکر صرف اس چیز کا ہے کہ نہ اسلام کی تاریخ میں اور نہ الحاد کی تاریخ میں کوئی مثال اس امر کی مل سکتی ہے کہ محض کتاب نے داعی اور لیڈر اور مصلح اور معلم کی حیثیت میں کوئی تحریک چلا دکھائی ہو، یا کوئی نظام اجتماعی قائم کر دیا ہو۔ ہر فکر اپنے ظہور کے لیے، ہر دعوت تحریک بننے کے لیے اور ہر اصولی فلسفہ ایک نظام زندگی کی شکل اختیار کرنے کے لیے اپنے مزاج کی لیڈر شیب کا محتاج ہے۔ اسانی سوسائٹی تبدیلی قبول ہی اسی طرح کرتی ہے۔ وہ محض کتابوں کے ذریعے نہیں بدلتی بلکہ کتابوں کی فکر جب کسی عملی انسان میں جلوہ گر ہوتی ہے تب وہ اس کے مطابق ڈھلنے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ انسانی پیکر میں عملی نمونے کی ضرورت یہ بھی ہے کہ وہ کسی فلسفے کو زندگی کے روزمرہ کے مسائل پر منطبق کر کے دکھائے، عملی نمونے کی ضرورت اس لحاظ سے بھی ہے کہ وہ کسی پروگرام کا قابل عمل ہونا ثابت کرنے کا واحد ذریعہ ہے، عملی نمونے کی ضرورت اس پہلو سے بھی ہے کہ اس کے ذریعے دعوت کے مخاطبین میں عملی توانیے بیدار ہوتے ہیں، عملی نمونے کی ضرورت یوں بھی ہے کہ لوگ ایک آئیڈیل کو محسوس شکل میں سامنے رکھ کر اس کے مطابق ارتقا کریں، تو ان نئی ضرورتوں کا خلاء کتاب پر نہیں کر سکتی۔

بہر حال انسانی فطرت اور انسانی سوسائٹی کے مزاج کا یہی تقاضا تھا کہ خدا نے اسکی ہدایت کا جب کبھی ارشاد کیا تو محض کتاب کی تمزیل پر اکتفا نہ کیا۔ اگر رسول کی تمزیل بھی غرضی، دعوت بھی تو داعی ہی ساتھ ہی ملے، فکر دی تو اس کے